برصغیر کے افق پر ایک نئی صبح

کہا جاتا ہے کہ برطانیہ کے ایک سابق وزیر خارجہ نے انگریزی سیاست کی حکمت بیان کرتے ہوئے کہا تھا: "انگریز کی سیاسی بصیرت (Political Wisdom of the English) کی بنیاد اس کی قابل ستائش "حماقت" (Praise worthy stupidity) ہے۔ وہ تجریدی اصول سے کوئی تعلق نہیں رکھتے' لیکن ایک دانا اور دانش مند کی طرف ان کا رویہ احترام و عزت کا ہوتا ہے۔"

چنانچہ انگریز نے پورے برصغیر پر جس شان و شوکت سے دو سو برس تک حکومت کی ہے' اس پر لکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر وہ زندگی کے تلخ حقائق کا سامنا نہ کرتے اور ان کی سیاست کی رگوں میں شاعری دوڑتی' تو وہ نہ تو حکومت کر سکتے تھے' اور نہ ہی آج دنیا کے بازار میں اپنی سیاسی و معاشی ساکھ قائم رکھ سکتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ترکی کی شہرۂ آفاق دانشور خاتون خالدہ ادیب نے اپنی کتاب "انڈیا" میں لکھا تھا: "ہر چند انگریزی زبان نے دنیا میں عظیم شاعری کو جنم دیا ہے۔ لیکن انگریز اس سے اپنی تنہائی میں لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنی سیاست کے حقیقت پسندانہ رویہ پر اسے اثر انداز ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔"

اس داستان سرائی سے مقصد یہ ہے کہ برصغیر کی آزاد قوموں نے (بھارت اور پاکستان) نے جس طرح گذشتہ پچاس سال تک اپنی سیاست کو "قابل ستائش حماقت" اور "حقیقت پسندانہ رویہ" سے دور رکھا ہے' اس کی سزا دونوں قوموں نے بھگتی ہے۔ دونوں معاشروں کی "اونچی سیاسی ذات" کو کوئی گزند پہنچا ہو یا نہ ہو' لیکن یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ دونوں ملکوں کے کروڑوں عوام اب تک غربت و افلاس کے جس جہنم میں زندگی بسر کر رہے ہیں' اس پر دونوں ملکوں کی ثقافتی' اخلاقی اور روحانی تاریخ ایک مدت تک ماتم کرتی رہے گی اور انسان

آسمان سے پوچھتا رہے گا:

کیا تجھ کو خوش آتی ہے آدم کی یہ ارزانی

آزادی کے بعد عام لوگوں کو مفاد پرستوں اور سماج دشمنوں کے ہاتھوں اپنی جان و مال کے تحفظ اور اپنی آبرو بچانے کے لیے جس طرح بے آبرو ہونا پڑا' تو انہیں بیتے ہوئے "غلامی" کے دن یاد آ گئے اور وہ درد و کرب کی شدت سے تڑپ تڑپ اٹھے' اس کا اندازہ پاکستان کے ایک سابق چیف جسٹس جناب محمد حلیم صاحب کے ایک انٹرویو سے لگایئے' جو انہوں نے اکتوبر ۱۹۹۸ کو جنگ اخبار' لندن ایڈیشن کو دیا۔

آپ (جسٹس محمد حلیم صاحب) سے پوچھا گیا' جو اپنے آبائی شہر لکھنؤ کو چھوڑ کر پاکستان آئے تھے:

سوال: "کبھی یہ احساس تو نہیں ہوا کہ پاکستان آ کر غلطی کی؟"

جسٹس صاحب نے فرمایا: "میں تو سمجھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہر نظام کو بدلتا ہے' یہ بھی اس کی رضا سے ہوا۔"

سوال: "یہ نہیں محسوس ہوتا کہ وہاں (لکھنؤ میں) آپ اچھے طریقے سے بسے ہوئے تھے؟"

جسٹس صاحب نے فرمایا: "انگریز کے جانے کے بعد اس زمانے کی بات ہی کرنا بے کار ہے' لیکن جو آرام و سکون وہاں تھا' وہ کبھی نہیں ملا۔"

سوال: "کیا انگریز کا دور بہتر تھا؟"

جواب: "بالکل بہتر تھا! ہر کوئی اپنے گھر میں محفوظ تھا۔"(۱)

جناب جسٹس محمد حلیم صاحب نے جس اختصار اور خوب صورتی سے ایک عام شہری کے سوز دروں کی کیفیت بیان کی ہے۔ وہ ہماری اجتماعی زندگی کی شکست کی آواز ہے۔

اس سماجی بگاڑ میں شدت اس وجہ سے بھی آئی کہ ان پچاس سالوں میں ان دونوں قوموں نے جو ثقافت' فلسفہ' ادب اور روحانی روایات میں ایک قابل فخر ورثہ کے مالک ہیں'

(۱) الفرقان' لکھنؤ' دسمبر ۱۹۹۸' ص ۳۴

تین جنگیں لڑی ہیں' جن پر نہ صرف کھربوں روپے صرف ہوئے ہیں بلکہ ہزاروں لوگوں کو اپنے گھروں سے بے گھر بھی ہونا پڑا' اور دونوں ملکوں کی معیشت پر اتنا بوجھ پڑا کہ کروڑوں انسان ایک باوقار زندگی کا منہ دیکھنے کے لیے اب تک آسمان کی طرف برابر دیکھ رہے ہیں۔ مقام مسرت ہے کہ نصف صدی کو غرق دریا کرنے کے بعد دونوں قوموں کے ارباب حکومت نے پہلی بار یہ طے کیا ہے کہ باہمی مسائل کو جنگ سے نہیں' بلکہ امن و آشتی' بات چیت اور صبر و تحمل سے طے کریں گے۔

برصغیر کی تاریخ میں یہ پہلا مبارک موقعہ ہے کہ دونوں ملکوں کی قومی اسمبلیوں کے معزز ارکان نے ۱۲ر فروری ۱۹۹۹ کو اسلام آباد میں اپنا پہلا مشترکہ اجلاس منعقد کیا ہے' اس اجلاس کا موضوع ہے: "امن' تحفظ اور تعاون"... اور اسی موضوع پر بات چیت کرنے کے لیے بھارت کے وزیر اعظم دہلی اور لاہور کے درمیان چلنے والی پہلی بس کے ذریعے ۲۰ر فروری کو لاہور پہنچ رہے ہیں' جہاں پر پاکستان کے وزیر اعظم ان کو خوش آمدید کہیں گے۔ ۱۲ اور ۱۳ فروری کو اسلام آباد میں دونوں ملکوں کے ارکان اسمبلی نے دوستانہ ماحول میں ان اختلافی مسائل پر بات چیت کی ہے جو دونوں ملکوں کے درمیان تلخیوں' رنجشوں کا باعث بنے ہوئے ہیں۔ ان مسائل میں سرفہرست اہل کشمیر کا مسئلہ ہے جسے دونوں ملکوں نے بہت پہلے اقوام متحدہ کی وساطت سے طے کرنے کا اقرار کیا تھا۔ اگر اس پر پیچ مسئلے کو بین الاقوامی قانون کے مطابق حل کرنے کے لیے دونوں ملک (خاص طور پر بھارت) تیار ہو جائیں' تو اس میں کسی کی سبکی نہیں' بلکہ حق یہ ہے کہ یہ انسانی انا کی نہیں' بلکہ دونوں قوموں کی روحانی اقدار کی فتح ہو گی جس پر دونوں ملک فخر سے اپنا سر بلند کر سکیں گے اور برصغیر کے کروڑوں انسانوں کی دکھی آتما کو شانتی مل جائیگی۔

یہ ٹھیک ہے کہ ان پچاس سالوں میں دونوں ملکوں کے شعراء' ادیب اور دوسرے قلمکار آپس میں ملتے رہے ہیں۔ ایسے ہی کشمیر کے بنیادی مسئلے کو طے کرنے کے لیے ماضی میں دونوں ملکوں کے وزرائے اعظم بھی کئی بار مل چکے ہیں' لیکن دونوں ملکوں کے پارلیمانی ارکان کا

یہ اجلاس اپنی نوعیت کا پہلا "غیر سرکاری" اجلاس ہے جس کا اہتمام لاہور کے ایک انگریزی روزنامہ "The News" نے کیا ہے جس میں دونوں ملکوں کی اسمبلیوں کے سو (۱۰۰) ممبر شریک ہوئے ہیں۔ پاکستان کی قومی اسمبلی کے ۶۰ ممبر حصہ لے رہے ہیں۔ جن کا تعلق دونوں سیاسی پارٹیوں یعنی حزب اقتدار اور حزب اختلاف سے ہے۔ ایسے ہی بھارت کی پارلیمنٹ کے ۳۵ سے زیادہ معزز ارکان ہیں جن کا تعلق بھارت کی تمام سیاسی پارٹیوں جن میں اکالی دل کے ارکان بھی ہیں' سے ہے۔ ان میں بعض ارکان مرکز میں وزیر اور دہلی کے وزیر اعلیٰ بھی رہ چکے ہیں۔ دونوں ملکوں کی اسمبلیوں کے معزز ارکان کی شرکت سے پتہ چلتا ہے' کہ دونوں ملکوں کے ارباب سیاست کو برصغیر کی حالیہ ژولیدہ اور پریشاں سیاسی اور اجتماعی صورت حال کا شدت سے احساس ہے۔ اسی گہرے احساس نے انہیں سیاسی سطح سے اٹھا کر statesmen کی بلندی پر پہنچا دیا ہے۔ لندن کے معروف اخبار Times نے گزشتہ صدی کے آخر میں لکھا تھا کہ: "طویل تربیت نے اسے سیاست دان (Politician) نہیں بلکہ مدبر (statesman) بنا دیا ہے۔ جو ایک شاہانہ نقطۂ نظر رکھنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔" ہمیں دونوں ملکوں کی قومی اسمبلیوں کے "سیاست دانوں" سے نہیں بلکہ "مدبر حضرات" سے توقع ہے کہ وہ دونوں ملکوں کے شدید اختلافی مسائل کو باوقار طور پر سلجھانے کی راہ ہموار کریں گے۔ یہ کوئی ایسا معمہ نہیں ہے' جسے حل نہ کیا جا سکے۔ اگر مغربی قومیں دو عالمی جنگوں کو بپا کرنے کے بعد اپنے اختلافات کو دفن کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں' تو پاک و ہند کے سیاست دان بھی یہ کارنامہ سرانجام دے سکتے ہیں' بشرطیکہ اپنی "سیاسی انا" کو اپنے مقدس مشن پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہ دیں' اگر ہزار سالہ مشترکہ تاریخ کا گہرا شعور بیدار ہو جائے تو پھر کوئی مشکل ایسی نہیں جس پر قابو نہ پایا جا سکے۔

بہت پہلے برصغیر کے مایۂ ناز فلسفی ادیب رابندر ناتھ ٹیگور نے کہا تھا: "ہندوستانی کلچر کا دریا چار نہروں کے روپ میں بہہ رہا ہے: وید' پوران' بدھ اور جین۔ اس کلچر کا سرچشمہ ہندوستانی شعور کی بلندیاں ہیں۔۔۔ ہاں اس دریا میں مسلمانوں کے ـــــ جو پے بہ پے باہر سے

اس سرزمین میں آتے رہے ـــــ علم، جذبات اور عظیم مذہبی جمہوریت سے تازہ لہریں اٹھتی رہیں۔ ہمارے ادب، آرٹ اور موسیقی میں مسلمانوں نے قیمتی اور مستقل خدمات (Contributions) سرانجام دی ہیں۔

جن حضرات نے قرون وسطی کے صوفیا کی تحریریں اور مسلمانوں کے دور حکمرانی میں وجود میں آنے والی مذہبی جماعتوں کی تاریخ پڑھی ہے، وہ جانتے ہیں کہ ہم اس بیرونی لہر کے کس حد تک مقروض ہیں، یہ لہر ہماری زندگی کا ایک حصہ بن گئی ہے۔"

ٹیگور کے ہم عصر، برصغیر کے معروف فلسفی شاعر علامہ اقبال نے ہندوستان کی عظیم روحانی روایات کے حوالہ سے شری کرشن جی اور اچاریہ شنکر کی عارفانہ اور فلسفیانہ خدمات کی تعریف کی ہے۔ اقبال اپنے ایک مضمون "عبدالکریم الجیلی کا نظریۂ توحید مطلق" میں دو معروف ہندوستانی عارفوں کپل (Kapil) اور شنکر اچاریہ (Shankaracharya) کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "ہم گہرے فلسفیانہ شعور میں ہندو مت کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں... ظہور اسلام کے بعد عربوں کی تاریخ شاندار عسکری فتوحات کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ اس نے انہیں ایک ایسا طرز زندگی اختیار کرنے پر مجبور کیا جس میں فلسفہ و علوم کے عظیم میدانوں میں نسبتاً خاموش فتوحات کرنے کے لیے بہت ہی کم فرصت تھی۔ اس لیے وہ کپل (Kapil) اور شنکر اچاریہ (Shankaracharya) جیسی شخصیتیں نہ پیدا کر سکے، نہ کر سکتے تھے۔"

ایک دوسری جگہ وہ شری کرشن جی کی تعلیمات کے بارے میں لکھتے ہیں:

> "شری کرشن جی کا نام ہمیشہ بہت عزت اور محبت کے ساتھ لیا جائے گا۔ کیونکہ اس عظیم انسان نے بہت ہی دل نشین پیرائے میں اپنے ملک و قوم کی فلسفیانہ روایت پر تنقید کی ہے اور یہ ثابت کر دکھایا ہے کہ

ترک عمل کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم عمل ہی کرنا چھوڑ دیں کیونکہ عمل (کرم) وہ شے ہے جس کا فطرت تقاضا کرتی ہے اور یہ زندگی میں نئی روح پیدا کرتا ہے۔ دراصل ترک عمل کا مطلب یہ ہے کہ ہم خود کو عمل کے نتائج سے بے تعلق کر لیں۔"

(سید مظفر حسین برنی: "محبِّ وطن اقبال")

(چندی گڑھ، ۱۹۸۵ء، ص ۷۱، ۷۲، ۹۳)

جاوید نامہ میں اقبال نے جنت میں بیٹھ کر ہندوستانی عارفوں سے جو بات چیت کی ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسرار حیات پر بات کرنا ہر دانشور، قلندر یا مدعی علم کے بس کی بات نہیں ہے۔

یہاں اس بات کا ذکر بے جا نہ ہو گا کہ امن و آشتی کا قیام جہاں سیاسی، اجتماعی اور اقتصادی حالات کا فطری مطالبہ ہے۔ جیسا کہ آج مغربی یورپ کے ملکوں نے اپنی تاریخی اور مذہبی رنجشوں کو بھلا کر ماضی کے حوالے کر دیا ہے اور باہمی تعاون سے ایک نئے خوش حال حال اور مستقبل کی تعمیر میں سرگرم عمل ہو گئے ہیں، لیکن مسلم قوموں کے لیے امن و آشتی کا قیام اسلامی نقطۂ نظر سے ازبس ضروری ہے۔ حالات خواہ کتنے ہی سنگین کیوں نہ ہوں لیکن اگر حریف صلح کی طرف ایک قدم چل کر آتا ہے تو مسلمانوں کو دو قدم آگے بڑھ کر اسے خوش آمدید کہنا چاہیے، ہماری روحانی تاریخ ہمیں یہی سبق دیتی ہے۔ مسلمانوں کے لیے آنحضرت ﷺ کا اسوۂ حسنہ ہدایت و رہنمائی کا سرچشمہ ہے۔ چنانچہ ہمیں آنحضرت ﷺ اور ان کے حریف ـــــ اہل مکہ کے باہمی مذاکرات سے سبق حاصل کرنا چاہیے، جن کے ہاتھوں آپ اور آپ کے جاں نثار ساتھی سالوں تک بڑے دکھ درد اٹھاتے رہے۔ آنحضرت ﷺ اور آپ کے ساتھی سن ۶ ہجری میں مدینہ سے مکہ روانہ ہوئے۔ مکہ سے قریب ایک گاؤں حدیبیہ پہنچے تھے کہ اہل مکہ نے مکہ میں داخل ہونے سے روک دیا، لیکن آپ نے خون خرابے سے بچنے کے لیے فرمایا کہ ہم صرف عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ آئے ہیں، اسے ادا کرتے ہی واپس چلے جائیں گے۔ لیکن

اہل مکہ کوئی بات سننے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ بالآخر اہل مکہ کی طرف سے سہیل نامی سردار بات چیت کے لیے آپ ؐ کے پاس پہنچا اور یہ طے پایا:

۱۔ اس سال آپ اور آپ کے ساتھی واپس مدینہ چلے جائیں۔

۲۔ مکہ کا جو آدمی مسلمان ہو کر مدینہ آئے' اسے واپس مکہ بھیج دیا جائے۔

۳۔ مدینہ سے جو آدمی مکہ آجائے' اسے واپس نہیں بھیجا جائے گا۔

جب معاہدہ طے ہو گیا اور لکھنے کا وقت آیا' تو آپ ؐ نے حضرت علی ؓ سے فرمایا: بسم اللہ کر کے معاہدہ لکھیں۔ لیکن اہل مکہ کے نمائندہ سہیل نے کہا کہ نہیں! "بسم اللہ الرحمٰن الرحیم" سے نہیں بلکہ عرب رواج کے مطابق "باسمک اللھم" لکھیں۔ آپ نے اسے مان لیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ لکھئے: "یہ معاہدہ جسے اللہ کے رسول (ﷺ) نے اہل مکہ سے طے کیا ہے..." تو سہیل نے کہا کہ اگر ہم آپ کو پیغمبر تسلیم کر لیں تو پھر جھگڑا ہی کیا ہے۔ اللہ کے رسول کے بجائے آپ اپنے نام کے ساتھ اپنے محترم والد کا نام لکھیں۔ چنانچہ آپ ؐ نے ایسا ہی کیا۔ اس معاہدے کو بعض صحابہ کرام ؓ نے مسلمانوں کی سبکی تصور کیا اور افسردہ تھے۔ لیکن آپ ؐ نے یہ معاہدہ کیا۔ لیکن ابھی مدینہ نہیں پہنچے تھے کہ راہ ہی میں سورۃ الفتح نازل ہوئی اور اس معاہدہ کو فتح سے تعبیر کیا گیا' کیوں کہ

۱۔ اس معاہدے کے ذریعے امن و آشتی نے جنگ پر فتح پائی تھی۔

۲۔ اہل مکہ نے جو اب تک آنحضرت ﷺ اور آپ ؐ کے ساتھیوں کا مذاق اڑاتے تھے؛ مسلمانوں کو پہلی بار ایک جماعت کی حیثیت سے تسلیم کر لیا۔

۳۔ مسلمانوں اور اہل مکہ کا کھل کر آزادانہ طور پر میل ملاپ شروع ہوا۔ جس سے مکہ اور غیر مسلموں کو مسلم جماعت کے پاکیزہ طرز عمل اور بلند طرز فکر کو دیکھنے کا موقع ملا جس سے نہ صرف مسلمانوں کے بارے میں غلط فہمیوں کا ازالہ ہوا بلکہ بہت سے لوگ ایک نئی صحت مند اخلاقی روایت کو پروان چڑھتے دیکھ کر مسلمان بھی ہو گئے۔ یہی وہ اخلاقی طرز فکر اور طرز عمل تھا' جب عرب جنوب کی راہ سے ہندوستان میں وارد ہوئے تو مقامی باشندوں نے مذہب اور

اخلاق کے افق پر نئی صبح کو مسکراتے دیکھا' تو انہوں نے نوواردوں کو خوش آمدید کہا۔ جواہر لال نہرو جیسے آزاد منش دانش ور بھی عربوں کے اس صحت مند طرز عمل' رواداری اور جمہوریت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے اور ہندوستانی سماج میں ان کی خدمات کی تعریف کی۔

غرضیکہ ہند و پاک کی موجودہ حکومتیں اور قومی اسمبلیاں اپنے باہمی مسائل اور قضیہ کشمیر کو امن و آشتی اور صبر و تحمل سے طے کر سکتی ہیں۔ اس بات سے شاید ہی کسی کو اختلاف ہو کہ باہمی مذاکرات کی کامیابی کے لیے باہمی اعتماد اور سازگار ماحول کا پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس پر تاریخ دونوں ملکوں کے ارباب اقتدار کا امتحان لے رہی ہے۔ ہماری دعا ہے کہ دونوں حکومتیں سنجیدگی و اخلاص سے کام لے کر تاریخ کو مایوس نہیں کریں گی۔

ہمارا کسی سیاسی گروہ سے کوئی تعلق نہیں' لیکن ایک مدت تک وادیٔ غربت میں دوڑنے پھرنے کے بعد ایک آرزو ضرور رکھتے ہیں کہ برصغیر میں آزاد قوموں کی (بھارت' پاکستان اور بنگلہ دیش) سرزمین امن و آشتی' خوش حالی اور باہمی تعاون کا گہوارا بن جائے اور اس کے ساتھ ساتھ اہل کشمیر کو ان کی مرضی کے مطابق جینے کا حق دیا جائے' آخر ان سے یہ حق کیسے چھینا جا سکتا ہے؟

گھر میں کیا تھا' جو ترا غم اسے ویراں کرتا
وہ جو ہم رکھتے تھے' اک حسرت تعمیر سو وہ ہے

رشید احمد (جالندھری)